بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

نظرات

النباء العظیم

(۶)

حالات کا تجزیہ کرنے کے بعد اب اس پر غور کرنا ہے کہ ان حالات سے عہدہ برآ ہونے کے لئے ہی نہیں بلکہ حالات کی اصلاح کرنے اور ان کو بہتر بنانے کے لئے ہمیں کیا کرنا ہے؟ جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا، مسلمان چونکہ ہندوستانی قومیت کا جزو ضعیف ہیں اس بنا پر معاشرہ میں جو فساد برپا ہے اس کی زد براہ راست مسلمان پر پڑتی ہے اور سب سے زیادہ نقصان اور خسارہ اسی کا ہوتا ہے چنانچہ فسادات جو بدقسمتی سے اس ملک کی روایت بن گئے ہیں اس دعوی کا بین ثبوت ہیں۔ اسی بنا پر مسلمان جو اس ملک کے شہری ہیں اور جن پر "شُہَدَآءُ لِلنَّاسِ" ہونے کی حیثیت سے ایک عالمی اور ہمہ گیر اصلاح بنی نوع انسان کی ذمہ داری بھی عائد ہوتی ہے۔ بحالات موجودہ ان کے دو منصوبے ہونے چاہیئے ایک میعادی منصوبہ (Short tern plan) اور دوسرا غیر میعادی منصوبہ (Long term plan)

اولین یعنی میعادی منصوبہ کا مقصد ان حالات سے عہدہ برآ ہونا ہے جو اگرچہ کتنے ہی سنگین اور تشویش انگیز ہوں، لیکن بہرحال عارضی ہیں۔ اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ اس سلسلہ میں پیشقدمی اور نہایت جرأت وہمت کے ساتھ کام کرنے کا اولین شرف وافتخار جمعیت علمائے ہند کو حاصل ہے۔ ذرا اُس وقت کو یاد کیجئے جب ملک کی آزادی اور تقسیم کے نتیجہ میں ہندوستان کا مسلمان بالکل

بے کس و بے بس اور سراسیمہ و پریشان ہو کر رہ گیا تھا اس پر خوف اور دہشت کا غلبہ اور مایوسی و ناکامی کے شدید احساس کا تسلط تھا۔ اس عالم میں جس جماعت نے اپنی جان پر کھیل کر مسلمانوں کی مدد کی اور ان میں خود اعتمادی پیدا کی — وہ صرف ایک جمعیت علماء ہی تھی اور جمعیت میں بھی سب سے زیادہ نمایاں، فعال اور موثر شخصیت مولانا محمد حفظ الرحمٰن سیوہاروی کی تھی۔ انھوں نے سخت مہیب اور خوفناک ماحول کو فضا میں جس جرأت و ہمت، جان فروشی اور بے لوثی و بے غرضی کے ساتھ مسلمانوں کی خصوصًا اور ملک و قوم کی عمومًا نہایت عظیم الشان خدمات انجام دی ہیں۔ مسلمان ان کے احسان سے کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتے۔ بے شبہ یہ خدمات مسلمانوں کی تاریخ قیادت کا روشن باب ہیں۔ اور اگر آج اس ملک کے مسلمان خود اعتمادی اور "جی داری" کے ساتھ اس ملک میں زندگی بسر کر رہے ہیں تو کوئی شک نہیں کہ اس میں بہت بڑا حصہ مولانا رحمۃ اللہ علیہ کا خصوصًا اور جمعیت میں ان کے رفقا کا عمومًا ہے۔ رحمۃ اللہ رحمۃً واسعۃً۔

لیکن اس موقع پر ہم قارئین کی توجہ دو چیزوں کی طرف مبذول کرانا چاہتے ہیں:

(۱) اول یہ کہ تقسیم کے بعد ہمارے نزدیک مسلمانوں کی پوزیشن اس شخص کی سی تھی جو کسی حق یا مطالبہ کے لئے اپنے بھائی کے خلاف عدالت میں مقدمہ لڑا ہو اور اس میں کامیاب ہو گیا ہو۔ چونکہ یہ شخص مقدمہ جیت گیا ہے اس بنا پر اس کا مطالبہ تو اسے ضرور ملے گا۔ لیکن اس کے بعد اگر اس شخص کو اپنے بھائی کے ساتھ رہنا سہنا اور خوشگوار تعلقات رکھنا ہے تو اب لامحالہ اس کو اپنے رویہ میں تبدیلی پیدا کرنی ہو گی۔ اس میں یک گونہ انفعال اور اس بات کا احساس ہونا چاہئے کہ اس کا مطالبہ صحیح تھا یا غلط۔ بہرحال عدالت کے ذریعہ اس کو حاصل کر کے اس نے اپنے بھائی کے دل میں آزردگی اور بیزاری کے جذبات پیدا کئے ہیں اور اس کی طرف سے اس کے دل میں میل آ گیا ہے۔ اس بنا پر اب اگر اسے کوئی طعنہ دے یا کڑوی کسیلی کوئی بات کہے بھی تو وہ سنی کو ان سنی کر دے اور پلٹ کر جواب ترکی بترکی دینے کی کوشش نہ کرے اور صرف

یہی نہیں بلکہ اپنی خدمت اور اپنے عمل و حسنِ اخلاق کے صابون سے اس زنگ اور میل کچیل کو دور کرنے کی سعی کرے جو مقدمہ ہارنے کے بعد اس کے بھائی کے قلب و دماغ پر جم گیا ہے۔

اس موقع پر ایک واقعہ کا ذکر نامناسب نہ ہوگا۔ غالباً ۴۹ء یا ۵۰ء کی بات ہے میں ان دنوں کلکتہ میں تھا اور شری پرشوتم داس ٹنڈن کانگرس کے صدر منتخب ہوئے تھے اسی حیثیت سے وہ کلکتہ بھی آئے اور محمد علی پارک میں تقریر کی۔ میں خود اس جلسہ میں موجود تھا۔ میں نے ٹنڈن جی کی تقریر سنی تو حیرت و استعجاب میں غرق ہو گیا۔ کیونکہ ان کی نسبت شہرت یہ تھی کہ اردو کے سخت دشمن ہیں اسے کوئی زبان ہی نہیں مانتے اور اسلامی تہذیب و ثقافت کی کوئی حیثیت تسلیم نہیں کرتے۔ اس عام شہرت کے برخلاف یہاں میں نے دیکھا کہ ٹنڈن جی نے نہایت شگفتہ اور برجستہ اردو میں تقریر کی اور اس میں موقع محل سے جا بجا مزے لے لے کر مولانا رومؔ اور حافظؔ کے فارسی اشعار بھی پڑھتے اور ان کی تشریح کرتے رہے۔ آخر مجھ سے صبر نہ ہوا، جلسہ کے اختتام پر میں ٹنڈن جی سے ملا اور کہا کہ میں چند منٹ کے لئے آپ سے تنہائی میں ملاقات کرنا چاہتا ہوں انھوں نے بڑی خندہ پیشانی سے مجھے قیام گاہ پر ملنے کے لئے کہا۔ میں وقت مقررہ پر وہاں پہونچا تو انھوں نے فوراً اندر بلا لیا اور اس وقت دو تین صاحبان جو موجود تھے انھیں رخصت کر دیا۔ اب گفتگو شروع ہوئی تو مجھے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ وہ مجھ سے پہلے سے واقف تھے اور انھیں یہ معلوم تھا کہ میں مدرسۂ عالیہ کلکتہ کا پرنسپل اور برہان کا اڈیٹر ہوں۔ اس واقفیت کے باعث انھوں نے گفتگو بڑی توجہ اور سنجیدگی سے شروع کی۔ اِدھر اُدھر کی ابتدائی گفتگو کے بعد جب میں اصل حرف مطلب پر آیا اور اردو زبان کی مخالفت کیساتھ انکی اس تقریر پر حیرت و استعجاب کا اظہار کیا تو وہ سنبھل کر بیٹھ گئے۔ اور بولے:

"مولانا! میں اردو زبان یا اس کے کلچر کا مخالف یا دشمن ہرگز نہیں ہوں۔ میں اردو کو اس ملک کی ہی پیاری اور دلنشیں زبان تسلیم کرتا ہوں۔ میں اسلام کا قدردان اور مسلمانوں کا دوست بھی ہوں اور مجھے یقین ہے کہ بھارت میں اردو بھی پھلے پھولے گی اور

مسلمان بھی اس ملک میں اپنے مذہب اور تہذیب کے ساتھ عزت سے برابر کے شہری بن کر رہیں گے لیکن اس وقت صورت حال یہ ہے کہ مذہب کے نام پر ملک کی تقسیم اور اس کے نتیجہ میں پاکستان سے ہندوؤں کے سخت بیکسی اور بربادی کے عالم میں اخراج کے باعث اس ملک کے کروڑوں ہندو ہیں جو مسلمانوں کے خلاف سخت مشتعل اور غیظ و غضب کے جذبات سے بھرے ہوئے ہیں۔ اس وقت مسلمانوں سے متعلق خواہ کیسی ہی کوئی بات حق اور انصاف کی کہی جائے۔ یہ ہندو اس کو سننے تک کے ہرگز روادار نہیں ہیں چنانچہ گاندھی جی کا جو حشر ہوا وہ اسی جنون اور دیوانگی کا نتیجہ تھا۔ ان حالات میں اگر ہم لوگ جو ہندو قوم پر کچھ اثر رکھتے ہیں حق گوئی اور صاف گوئی میں وہی راستہ اختیار کریں جو گاندھی جی کا تھا تو ہمارا حشر بھی وہی ہوگا جو ان کا ہوا اور کم از کم میں اس کے لئے تیار نہیں ہوں۔ کیونکہ مجھے اپنی قوم سے بہر حال کام لینا اور ان کی سیوا کرنا ہے۔"

میں نے کہا "بجا فرمایا آپ نے! لیکن یہ بھی بتائیے کہ آخر مسلمان کیا کریں!" ٹنڈن جی نے پہلو بدلا اور پھر بولنا شروع کیا اور کہا:

"اس وقت مسلمانوں کے لئے (اور خود ہمارے لئے بھی) سب سے زیادہ تشویش کی جو بات ہے وہ فسادات ہیں جو ایک لاوے کی طرح پھٹ پڑے ہیں اور جن سے مسلمانوں کے جانی اور مالی نقصانات ہو رہے ہیں۔ اس سلسلے میں میرا خیال ہے کہ حکومت کو بڑی قوت اور مستعدی کے ساتھ ان فسادات کو ختم کرنا اور ان فسادات کے اسباب و وجوہ پر کڑی نظر رکھنا چاہئے۔ لیکن جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ مسلمان صبر و ضبط اور تحمل و برداشت سے کام لیں اور کم از کم دس برس کے لئے یہ عہد کر لیں کہ ہندو لیڈر یا ہندو اخبارات ان کو خواہ کتنا ہی برا بھلا کہیں، کیسی ہی جلی کٹی سنائیں، طعنہ دیں، اردو زبان کی مخالفت کریں اور ان کے خلاف دوسری اشتعال انگیز باتیں کہیں بہر حال مسلمان خاموش رہیں سنی ان سنی کر دیں۔ اور ان کی کسی بات کا کوئی جواب نہ دیں۔ کیونکہ اگر انھوں نے جواب دیا تو پھر

جواب در جواب کا چکر چل پڑے گا اور اس کے باعث دونوں فرقوں میں جو خلیج حائل ہے وہ کم ہونے کے بجائے وسیع سے وسیع تر ہوتی رہے گی اور فرقہ پرستی کو پھلنے پھولنے کا موقع ملے گا اور چونکہ مسلمان اقلیت میں ہیں اس بنا پر ان کی فرقہ پرستی تو ہندوؤں کو ایسا کچھ زیادہ نقصان پہونچا نہیں سکے گی۔ البتہ ہندو جو بڑی بھاری اکثریت میں ہیں ان کی فرقہ پرستی مسلمانوں کو پنپنے نہیں دے گی۔

میں نے ملاقات کے لئے صرف پندرہ منٹ لئے تھے۔ اب گھڑی جو دیکھی تو آدھے گھنٹہ سے زیادہ ہوچکا تھا۔ میں نے ٹنڈن جی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ان سے اجازت لی اور رخصت ہونے لگا تو ٹنڈن جی نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا: ”اکبرآبادی صاحب! میری اور آپ کی یہ گفتگو بالکل نجی اور پرائیویٹ ہے۔ اسے ایسا ہی رہنا چاہئے۔“ میں نے پوچھا کہ کیا اس کو شائع کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ انھوں نے کہا ”جی نہیں“! پھر کچھ دیر رک کر بولے: ”کم از کم ابھی پندرہ بیس برس نہیں“ میں نے کہا بہت اچھا! ایسا ہی ہوگا۔ چنانچہ آج بیس برس کے بعد پہلی مرتبہ میں اس کا ذکر کر رہا ہوں۔

حکمت کی بات اگر دشمن کی زبان سے بھی نکلے تو اسے قبول کرنا چاہئے۔ مجکو یہ کہنے میں پس و پیش نہیں ہے کہ ٹنڈن جی نے جو بات کہی وہ میرے لئے اجنبی نہیں تھی۔ میں خود بھی اسی طرح سوچنے کا عادی تھا اور وقتاً فوقتاً اپنے اسی انداز فکر کی روشنی میں مولانا محمد حفظ الرحمٰن صاحب سے گفتگو بھی کرتا رہتا تھا لیکن یہاں معاملہ ہی کچھ اور تھا۔ مولانا اپنی ذات اور شخصیت کے لحاظ سے ایک شمشیر برہنہ تھے۔ کسی کے سامنے لچکنا اور الفاظ چبا چبا کر بات کرنا ان کی فطرت اور جوہر طبیعت کے خلاف تھا۔ پھر وہ اور ان کی جماعت نے ہندوؤں کے ساتھ دوش بدوش کھڑے ہوکر آزادی کی جنگ لڑی اور اس راہ میں بڑی سے بڑی قربانیاں دی تھیں اور تقسیم کے سخت مخالف تھے۔ اس بنا پر ان کی آنکھیں نہ حکومت